باب 7

سرسیّد احمد کا عہد

13085CH07

سرسیّد احمد خاں انیسویں صدی کے ایک بڑے رہنما اور مصلح ہیں۔ اس وقت دوسری اقوام کے مقابلے میں مسلمانوں کی حالت ابتر تھی۔ سرسید نے محسوس کیا کہ بدلے ہوئے حالات میں جدید علوم کے بغیر ان کی ترقی ممکن نہیں۔ تعلیم ہی ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے ان کی اصلاح ہو سکتی ہے۔ انھوں نے مسلمانوں کی زندگی کے ہر شعبے پر توجہ کی اور جہاں جہاں خرابیاں نظر آئیں، انھیں دور کرنے کی عملی کوشش کی۔ ان کی انھی کوششوں کو 'سرسیّد تحریک' یا علی گڑھ تحریک کے نام سے جانا جاتا ہے۔

اردو ادب پر سرسیّد کی تحریک کے گہرے اثرات ہیں۔ وہ ادب کی افادیت اور مقصدیت کے قائل تھے۔ انھوں نے اپنے مضامین کے ذریعے علمی نثر کی بنیاد ڈالی۔ ان کے عہد میں ایسے بہت سے ادیب ہوئے جنھوں نے اردو نثر کے ارتقا اور فروغ میں نمایاں کارنامے انجام دیے۔ اسی عہد میں مضمون نگاری، انشائیہ نگاری، ناول نگاری، سوانح نگاری، تاریخ نگاری اور تنقید نگاری کا باقاعدہ آغاز ہوا۔

سرسیّد (1817-1898): ان کا نام سیّد احمد خاں تھا۔ وہ دہلی کے ایک معزز گھرانے میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے تعلیم کے مراحل دہلی میں طے کیے اور اپنے زمانے کے اہلِ کمال سے فیض حاصل کیا۔ 1839 میں انھوں نے انگریزی سرکار کی ملازمت اختیار کی۔ 1862 میں جب وہ غازی پور میں تھے، 'سائنٹفک سوسائٹی' کے نام سے انھوں نے ایک انجمن بنائی۔ اس انجمن کا مقصد ہندوستانیوں میں مختلف علوم، خاص کر سائنسی علوم کے مطالعے کو فروغ دینا تھا۔ 1869 میں سید احمد خاں انگلستان چلے گئے جہاں تقریباً ڈیڑھ برس تک ان کا قیام رہا۔ واپس آکر انھوں نے انگلستان میں شائع ہونے والے بعض علمی اور سماجی رسالوں کے طرز پر 'تہذیب الاخلاق' کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا۔ اس کی بدولت اردو میں مضمون نگاری کو بہت ترقی ملی۔

سید احمد خاں نے علی گڑھ میں 1875 میں ایک اسکول قائم کیا۔ یہ اسکول 1878 میں 'محمڈن اینگلو اورینٹل کالج' اور پھر 1920 میں 'علی گڑھ مسلم یونیورسٹی' کی شکل میں ہندوستان کا ایک نمایاں تعلیمی ادارہ بن گیا۔

1878 میں سید احمد خاں کو 'سر' کا خطاب ملا۔ اس لیے لوگ انھیں 'سرسید' کے نام سے جانتے ہیں۔ وہ آخر عمر تک تعلیمی و تصنیفی سرگرمیوں میں مشغول رہے۔ 'آثار الصنادید'، 'اسبابِ بغاوتِ ہند'، اور 'سرکشی ضلع بجنور' ان کی خاص تصانیف ہیں۔ سائنس، فلسفہ، مذہب اور تاریخ سے متعلق ان کے مضامین کئی جلدوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ درج ذیل ادبی اصناف کے ارتقا میں سرسید احمد خاں کے عہد کا نمایاں رول ہے۔

مضمون :

عہدِ سرسید سے پہلے اہل قلم کسی موضوع پر یا تو مستقل کتابیں لکھتے یا رسالے تصنیف کرتے تھے۔ چھوٹے چھوٹے مضامین کی شکل میں کسی موضوع پر اظہارِ خیال کا سلسلہ پہلے 'دہلی کالج' سے شروع ہوا جسے آگے چل کر سرسید نے 'تہذیب الاخلاق' کے ذریعے فروغ دیا۔ سرسید کے مضامین مختلف موضوعات سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس لحاظ سے انھیں سائنسی، علمی، اخلاقی، معاشرتی اور مذہبی وغیرہ مختلف قسموں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

حالیؔ اور شبلیؔ بھی اس عہد کے اہم مضمون نگار تھے۔ انھوں نے مضمون نگاری کا معیار بلند کیا اور اسے زیادہ مرتّب اور منظّم شکل عطا کی۔ سرسید کے دوسرے رفیقوں میں محسن الملک، چراغ علی اور مولوی ذکاء اللہ نے بھی مضمون نگاری میں نمایاں حصّہ لیا ہے۔

انشائیہ :

انشائیہ بھی مضمون ہی کی ایک قسم ہے۔ اس کا انداز عالمانہ اور سنجیدہ مضامین سے مختلف ہوتا ہے۔ انشائیے میں بات ہلکے پھلکے اور شگفتہ پیرایے میں کہی جاتی ہے۔ یہاں گفتگو کو اس طرح آگے بڑھاتے ہیں کہ بات سے بات نکلتی چلی جائے۔ اردو میں انشائیے کا سلسلہ بھی سرسید سے شروع ہوتا ہے۔ 'امید کی خوشی'، 'گزرا ہوا زمانہ'، 'بحث و تکرار' اور 'خوشامد' جیسے ان کے متعدد مضامین میں انشائیے کا انداز ملتا ہے۔ اس عہد میں محمد حسین آزاد نے انشائیہ نگاری کے فن کو بہت فروغ دیا۔ انھوں نے انگریزی کے تمثیلی مضامین کے طرز پر اردو میں انشائیے لکھے۔ آزادؔ کے یہ انشائیے 'نیرنگِ خیال' کے نام سے شائع ہوئے۔

ناول :

اردو میں ناول نگاری کا آغاز بھی اسی زمانے سے ہوتا ہے۔ مانا جاتا ہے کہ اردو کے پہلے ناول نگار ڈپٹی نذیر احمد ہیں۔ 'مرأۃ العروس'، 'ابن الوقت'، 'توبۃ النصوح' اور 'بنات النعش' ان کے مشہور ناول ہیں۔ ناول نگاری کی روایت کو اسی عہد میں پنڈت رتن ناتھ سرشارؔ، عبدالحلیم شررؔ اور مرزا ہادی رسواؔ نے بہت کامیابی اور خوب صورتی کے ساتھ آگے بڑھایا۔ سرشارؔ کے 'فسانۂ آزاد'، شررؔ کے 'فردوسِ بریں' اور مرزا رسواؔ کے 'امراؤ جان ادا' کا شمار اس عہد کے اہم ناولوں میں ہوتا ہے۔

سوانح :

عہدِ سرسید کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں نہ صرف اردو میں سوانح نگاری کی روایت قائم ہوئی بلکہ بڑی حد تک اس کے اصول وآداب بھی متعین ہوئے۔ اس دور کے سب سے پہلے اور باقاعدہ سوانح نگار مولانا الطاف حسین حالیؔ ہیں۔ انھوں نے 'حیاتِ سعدی'، 'یادگارِ غالبؔ' اور 'حیاتِ جاوید' جیسی اہم سوانح عمریاں لکھیں۔ اس روایت کو شبلی نعمانی نے آگے بڑھایا۔ 'المامون'، 'الفاروق'، 'سیرۃ النعمان' اور 'سیرۃ النبیؐ' وغیرہ ان کی مشہور سوانح عمریاں ہیں۔

تاریخ :

عہدِ سرسید میں اردو میں باقاعدہ تاریخ نویسی کا سلسلہ بھی شروع ہوا۔ سرسید کی تصانیف میں 'آثارالصّنادید'، 'تاریخِ سرکشیِ ضلع بجنور' اور 'اسبابِ بغاوتِ ہند' وغیرہ تاریخ نویسی کے دائرے میں آتی ہیں۔ اسی طرح شبلیؔ نعمانی کے یہاں تاریخ نویسی کا ایک خاص ذوق نظر آتا ہے۔ انھوں نے بہ کثرت تاریخی مضامین لکھے اور تاریخی موضوعات پر 'مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم'، 'اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر' اور 'تاریخِ علم الکلام' جیسی کتابیں بھی تصنیف کیں۔

اس ضمن میں مولوی ذکاء اللہ کی خدمات بہ طورِ خاص قابلِ ذکر ہیں۔ ان کی لکھی ہوئی 'تاریخِ ہند' کئی جلدوں پر مشتمل ہے۔ عبدالحلیم شررؔ کے تاریخی مضامین اور خاص طور پر ان کی کتاب 'گذشتہ لکھنؤ' بھی تاریخ نویسی میں اعلیٰ مرتبہ رکھتی ہے جسے ایک تہذیبی تاریخ سے بھی موسوم کیا جاسکتا ہے۔

تنقید :

اردو میں باقاعدہ تنقید نگاری کا آغاز بھی عہدِ سرسید ہی سے ہوتا ہے۔ اردو کے پہلے باقاعدہ نقاد مولانا الطاف حسین حالیؔ ہیں اور اردو کی پہلی تنقیدی کتاب 'مقدمۂ شعروشاعری' (1893) ہے۔ حالیؔ نے اس میں شعر کی ماہیت، اچھی شاعری کی خصوصیات اور شاعر کے فرائض وغیرہ سے بحث کے بعد اپنے نظریات کی روشنی میں اردو شاعری کی مختلف اصناف (غزل، مثنوی، مرثیے) کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔

اس دور کے دوسرے اہم نقاد محمد حسین آزاد ہیں۔ محمد حسین آزادؔ کی 'آبِ حیات' بھی اسی دور سے تعلق رکھتی ہے مگر اس میں تنقید سے زیادہ تحسین کا پہلو حاوی ہے۔ آزاد کی انفرادیت میں ان کی شگفتہ بیانی کا خاص حصّہ ہے۔ شبلؔی نعمانی کا شمار بھی اس عہد کے اہم نقادوں میں ہوتا ہے۔ 'موازنۂ انیؔس و دبیرؔ' اور 'شعر العجم' میں انھوں نے اپنے تنقیدی نظریات تفصیل کے ساتھ پیش کیے ہیں۔

ان تفصیلات سے عہدِ سرسید میں اردو نثر کی مجموعی صورتِ حال کا بہ خوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ آئندہ صفحات میں اس دور کی اہم شخصیات کا علاحدہ ذکر کیا گیا ہے۔

محسن الملک (1907-1817/37) : ان کا نام سیّد مہدی علی اور خطاب محسن الملک تھا۔ وہ اٹاوہ میں پیدا ہوئے۔ عربی فارسی کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد سرکاری ملازم ہو گئے اور ترقی کرتے کرتے تحصیل دار کے عہدے تک پہنچے۔ انھوں نے قانون کے موضوع پر دو کتابیں لکھیں جنھیں انگریز حکام نے مفید قرار دیا اور انھیں ڈپٹی کلکٹر بنا دیا۔ ان کی کارکردگی کی شہرت کی بنا پر انھیں حیدرآباد بلا لیا گیا۔ یہاں وہ مالیات کے انسپکٹر مقرر ہوئے۔ ان کی خدمات کے اعتراف میں ریاست کی طرف سے 'محسن الدولہ'، 'محسن الملک'، اور 'منیر نواز جنگ' کے خطابات عطا ہوئے۔ 1892 میں علی گڑھ آ گئے اور باقی زندگی ایم۔اے۔او۔ کالج کی خدمت میں صرف کر دی۔ شملہ میں ان کا انتقال ہوا اور تدفین علی گڑھ میں ہوئی۔

محسن الملک نے ہر قدم پر سرسید کے ساتھ تعاون کیا۔ اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعے سرسید کے افکار و خیالات کو دور دور تک پھیلانے میں مدد دی۔ وہ 'تہذیب الاخلاق' کے باقاعدہ لکھنے والوں میں سے تھے۔ ان کی نثر سنجیدہ و دلکش اور زبان سادہ و آسان ہے۔

محمد حسین آزادؔ (1910-1830): مولانا محمد حسین آزادؔ دہلی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد وہ 1846 میں دہلی کالج میں داخل ہوئے۔ چار سال میں انھوں نے یہاں کی تعلیم مکمل کر لی۔ آزادؔ کے والد مولوی محمد باقر نے اردو کا پہلا اخبار 'دہلی اردو اخبار' نکالا۔ اردو کے مشہور شاعر شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ سے آزادؔ کے والد کے گہرے مراسم تھے۔ انھوں نے آزادؔ کو تعلیم و تربیت کے لیے ذوقؔ کے سپرد کر دیا تھا۔

1857 تک آزادؔ کی زندگی بڑے عیش و آرام میں بسر ہوئی۔ وہ ادبی مشغلوں میں اپنا وقت گزارتے اور اخبار کے کاموں میں والد کی مدد کرتے تھے۔ مولوی محمد باقر ہندوستان کے پہلے صحافی تھے جنھیں انگریزوں سے بغاوت کے جرم میں گولی ماری گئی تھی۔

حکومت کی نظر میں آزادؔ مجرم تھے۔ اس لیے وہ دہلی سے فرار ہوگئے اور برسوں در بدر کی ٹھوکریں کھاتے رہے۔ آخر کار 1864 میں لاہور میں محکمۂ تعلیم میں ملازم ہوئے۔ وہاں ان کی ملاقات پنجاب یونیورسٹی کے رجسٹرار ڈاکٹر لائٹنر سے ہوئی۔ ان کی سر پرستی میں آزادؔ نے بچوں کے لیے درسی کتابوں کا ایک سلسلہ شروع کیا۔ بعد میں محکمۂ تعلیم کے ڈائریکٹر کرنل ہالرائڈ کے ساتھ مل کر آزادؔ نے نئی نظم نگاری کو فروغ دیا۔

آزاد کچھ دنوں گورنمنٹ کالج، لاہور میں عربی، فارسی کے پروفیسر بھی رہے۔ 1887 میں انھیں 'شمس العلما' کا خطاب ملا۔ اس دوران ان کی جوان بیٹی کی موت ہوگئی۔ آزاد اس صدمے کو برداشت نہ کر سکے۔ آخر کار ان کا ذہنی توازن بگڑ گیا۔ ان کی زندگی کے بقیہ بیس سال دیوانگی میں بسر ہوئے۔

آزادؔ بلاشبہ اردو کے بڑے انشا پرداز ہیں۔ ان کی نثر میں جادو کی سی تاثیر ہے۔ جو لکھ دیتے ہیں دل پر نقش ہو جاتا ہے۔ ان کی نثر بظاہر سادہ لیکن بہت سجی ہوئی ہوتی ہے۔ تشبیہوں اور استعاروں کی مدد سے وہ زبان کو رنگین بنانے کے ہنر سے واقف تھے۔

آزادؔ نے بچوں کے لیے درسی کتابیں بھی لکھیں اور 'قصصِ ہند' کے نام سے تاریخی کہانیاں بھی تحریر کیں، لیکن 'آبِ حیات' (1881) ان کا شاہکار ہے۔ یہ اردو زبان اور شاعری کی پہلی تاریخ ہے۔ اس میں اردو شاعری کے مختلف ادوار قائم کیے گئے ہیں۔ آبِ حیات میں آزادؔ کے جادو نگار قلم نے شعرا کے جو مرقّعے تیار کیے ہیں، وہ بے مثال ہیں۔ البتہ شاعروں کے کلام پر آزاد نے جو تنقید کی ہے اس میں تجزیے کی کمی کا احساس ہوتا ہے۔ اس کتاب میں بیان کیے گئے حالات اور واقعات بعض جگہ تحقیق کے معیار پر پورے نہیں اترتے۔ آزادؔ کی دوسری اہم کتابوں میں 'نیرنگِ خیال'، 'دربارِ اکبری' اور 'سخن دانِ فارس' کے نام شامل ہیں۔

مولوی ذکاء اللہ (1910-1832) : ذکاء اللہ کی پیدائش اور نشو و نما دہلی میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم کے بعد دہلی کالج میں داخل ہوئے۔ کالج کے مضامین میں انھیں سب سے زیادہ دلچسپی ریاضی سے تھی۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد دہلی کالج ہی میں ریاضی کے استاد مقرر ہوئے۔ اس کے بعد آگرہ کالج میں فارسی اور اردو پڑھانے پر مامور ہوئے۔

1855 میں انھیں ڈپٹی انسپکٹر مدارس بنایا گیا۔ 1866 میں وہ نارمل اسکول، دہلی کے ہیڈ ماسٹر ہوگئے۔ 1869 میں میور سنٹرل کالج، الہ آباد میں پروفیسر کے عہدے پر ان کا تقرر ہوا۔ 1885 میں وہ ملازمت سے سبک دوش ہوئے۔ انھوں نے دہلی میں وفات پائی۔

ذکاءاللہ سرسید کے رفقا میں تصانیف کی کثرت کے لحاظ سے سب سے ممتاز ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے ریاضی، تاریخ، جغرافیہ، فزکس، ہیئت، سیاست اور ادب جیسے موضوعات پر 143 کتابیں تصنیف کیں۔ اس کے علاوہ ان کے مضامین کی تعداد بھی بہت ہے۔ ان کا اسلوب نگارش سیدھا سادا ہے۔ وہ عبارت آرائی سے کام نہیں لیتے۔ اردو نثر کے دامن کو وسیع کرنے اور اسے طرح طرح کے موضوعات سے مالا مال کرنے میں ذکاءاللہ کا بڑا حصہ رہا ہے۔ ذکاءاللہ کی سب سے اہم تصنیف 'تاریخِ ہند' ہے جو 10 جلدوں پر مشتمل ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد (1912-1836): نذیر احمد کی پیدائش بجنور میں ہوئی۔ وہ ایک غریب گھرانے کے فرد تھے۔ علم کے شوق میں بچپن میں دہلی آ گئے۔ پہلے ایک مدرسے میں پڑھا۔ اس کے بعد دلّی کالج میں تعلیم حاصل کی۔ نذیر احمد کو عربی ادب میں بڑی مہارت حاصل تھی۔ وہ انگریزی زبان کی بھی سوجھ بوجھ رکھتے تھے۔

نذیر احمد 1863 میں ڈپٹی کلکٹر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ 1877 میں سر سالار جنگ نے انھیں حیدر آباد بلا لیا۔ کچھ عرصے بعد وہ ترقی کر کے بورڈ آف ریونیو کے ممبر ہو گئے۔ قبل از وقت پنشن لے کر دہلی آ گئے اور زندگی کے بقیہ دن یہیں گزارے۔

نذیر احمد دہلی کی زبان اور محاوروں پر غیر معمولی قدرت رکھتے ہیں۔ ان کا ایک بڑا کارنامہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے اردو میں ناول نگاری کا باقاعدہ آغاز کیا۔ اس صنف کا آغاز انھوں نے شعوری طور پر نہیں کیا بلکہ اپنی بچیوں کی تربیت کے لیے الگ الگ کتابیں لکھنی شروع کیں۔ دو دو چار چار صفحات لکھ کر انھیں دیتے جاتے اور جب ان صفحات کا سبق پورا ہو جاتا تو مزید صفحات لکھ دیتے۔ اس طرح یہ کتابیں مکمل ہو گئیں۔ ان کتابوں کی مقبولیت دیکھ کر نذیر احمد نے کئی اور کتابیں لکھیں۔ یہی کتابیں اردو ناولوں کا اوّلین نقش ہیں۔ نذیر احمد کے ناولوں کے نام ہیں مرأۃ العروس' (1869)، 'بنات النعش' (1873)، 'توبۃ النصوح' (1877)، 'رویائے صادقہ'، 'ابن الوقت' (1888)، 'ایامیٰ' اور 'فسانۂ مبتلا'۔

نذیر احمد کے یہ تمام ناول مقصدی اور اصلاحی ہیں اس لیے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ ناول نہیں، تمثیلی قصّے ہیں۔ ناول نگاری کے ابتدائی نمونہ ہونے کی وجہ سے ان میں بعض فنّی خامیاں موجود ہیں۔ البتہ ان ناولوں کی خوبی یہ ہے کہ ان میں اس وقت کا سماج جیتا جاگتا نظر آتا ہے۔ نذیر احمد نے ناولوں کے علاوہ مذہبی تصانیف اور انگریزی کتابوں کے بہت اچھے ترجمے بھی یادگار چھوڑے ہیں۔ 'الحقوق والفرائض' مذہبی تصانیف میں اور

'انڈین پینل کوڈ' کا اُردو ترجمہ 'تعزیراتِ ہند' ترجموں میں سرِ فہرست ہیں۔ انھوں نے قرآن کا بھی ترجمہ کیا ہے۔

حالؔی (1837-1914/15): ان کا نام خواجہ الطاف حسین اور تخلص حالؔی تھا۔ وہ پانی پت میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے پانی پت اور دہلی میں تعلیم حاصل کی۔ انھیں با قاعدہ اور سلسلہ وار تعلیم کا موقع نہیں ملا لیکن اپنے علمی شوق اور مطالعے کے ذوق کی بدولت انھوں نے فارسی و عربی میں بھی مہارت حاصل کر لی تھی۔ وہ اپنے زمانے میں رائج مذہبی اور غیر مذہبی علوم وفنون سے پوری واقفیت رکھتے تھے۔

حالی کے ادبی ذوق کی تربیت دہلی کی ادبی مجلسوں اور شیفتؔہ و غالبؔ کی صحبتوں میں ہوئی تھی۔ ان سب چیزوں نے مل کر انھیں ایک اچھا شاعر اور صاحبِ بصیرت ناقد و مصنف بنا دیا۔ 1856 میں ضلع حصار میں وہ کلکٹر کے دفتر میں ملازم ہوئے۔ 1857 کے ہنگاموں میں یہ ملازمت جاتی رہی۔ اس کے بعد وہ نواب مصطفیٰ خاں شیفتؔہ سے وابستہ ہوگئے اور تقریباً آٹھ برس وہ ان کے ساتھ رہے۔ شیفتؔہ کی وفات کے بعد 1872 میں لاہور کے گورنمنٹ بک ڈپو میں ملازم ہوئے۔ یہاں انگریزی کتابوں کے اردو ترجموں کی اصلاح کی خدمت ان کے سپرد ہوئی۔ چار سال وہاں رہ کر وہ دہلی واپس آئے اور اینگلو عربک اسکول میں مدرّس ہوگئے۔

1887 میں ریاست حیدرآباد نے ان کے لیے پچھتّر روپے ماہوار کا وظیفہ مقرر کیا۔ 1891 میں جب یہ وظیفہ سو روپے ماہوار ہوگیا تو حالؔی نے اسکول کی ملازمت چھوڑ دی اور پانی پت جا کر تصنیف و تالیف کے کاموں میں مشغول ہوگئے۔ وہیں ان کی وفات ہوئی۔

سرسید کے رفقا میں حالؔی اس لحاظ سے ممتاز ہیں کہ انھوں نے سرسید کے مشن کو پورے طور پر اپنا لیا تھا۔ وہ چھوٹے بڑے تمام معاملات میں سرسید کی روش کو سراہتے اور اس کی تقلید کی کوشش کرتے تھے۔ اپنے اسلوب اور طرزِ نگارش میں بھی انھوں نے سرسید کی پیروی کی۔ سرسید کی طرح ان کی نثر بھی سادہ اور بے تکلف ہوتی ہے۔ وہ خیالات کو عام فہم بنانے کی خاطر تشبیہات و استعارات اور فارسی ترکیبوں سے بچتے ہیں۔ حالؔی کی نثر نگاری کا آغاز 1867 میں ہوا۔ ان کی پہلی نثری تصنیف 'مجالس النساء' ہے۔

نثر نگار کی حیثیت سے حالؔی کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ وہ اردو میں سوانح نگاری کے بانی ہیں۔ انھوں نے تین سوانح عمریاں لکھی ہیں۔ 'حیاتِ سعدی' (1886)، 'یادگارِ غالبؔ' (1897) اور 'حیاتِ جاوید' (1901)۔ حالؔی کا دوسرا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے 'مقدمۂ شعر و شاعری' (1893) لکھ کر اردو میں با قاعدہ تنقید نگاری کی روایت قائم کی۔

حالؔی نے اس مقدمے میں تنقید کے اچھے اور مفصّل نمونے پیش کیے ہیں۔ مقدمے کی بحث کا حاصل یہ ہے کہ شاعری کو مفید اور بامقصد ہونا چاہیے۔ چوں کہ پرانی شاعری اس معیار پر پوری نہیں اترتی اس لیے اردو میں نئی شاعری کی ضرورت ہے۔ اس کتاب کے اردو تنقید پر گہرے اثرات مرتّب ہوئے۔

سرشارؔ (1846-1902/03) : ان کا نام پنڈت رتن ناتھ اور تخلص سرشارؔ تھا۔ ان کی پیدائش لکھنؤ میں ہوئی۔ وہ یہیں پلے بڑھے۔ ابتدائی تعلیم اور فارسی وغیرہ پڑھنے کے بعد انھوں نے کیننگ کالج، لکھنؤ میں داخلہ لیا لیکن درمیان میں تعلیم چھوڑ دینے کی وجہ سے کوئی ڈگری حاصل نہ کر سکے۔

تعلیم کا سلسلہ ختم ہو جانے کے بعد لکھیم پور کھیری میں وہ ایک اسکول میں مدرس ہو گئے۔ اس کے ساتھ 'مراسلۂ کشمیر'، 'اودھ پنچ' اور بعض دوسرے اخبارات میں مضمون نویسی بھی کرتے رہے۔ ان مضامین نے انھیں ادبی حلقوں میں متعارف کرایا۔ چنانچہ 1878 میں منشی نول کشور نے انھیں 'اودھ اخبار' کا ایڈیٹر مقرر کر دیا۔ اودھ اخبار سے سرشارؔ کا تعلق اس لحاظ سے بہت مفید ثابت ہوا کہ سرشارؔ نے اس میں اپنا مشہور ناول 'فسانۂ آزاد' قسط وار شائع کرنا شروع کیا۔ یہ ایک دلچسپ ناول تھا جس نے انھیں شہرت کے آسمان پر پہنچا دیا۔

1893 کے آس پاس وہ 'اودھ اخبار' سے الگ ہو گئے۔ 1895 میں مہاراجا کشن پرشاد کی دعوت پر حیدرآباد چلے گئے اور وہاں 'دبدبۂ آصفی' کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ حیدرآباد ہی میں ان کی وفات ہوئی۔

سرشارؔ کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے 'فسانۂ آزاد' میں چھوٹے چھوٹے قصّوں، دل چسپ واقعات، پُرلطف مناظر اور رنگ برنگے کرداروں کی وہ بھیڑ بھاڑ اور گہما گہمی پیدا کر دی ہے جس کی مثال ہمارے ادب میں اور کہیں نہیں ملتی۔ سرشارؔ کا یہ بھی کارنامہ ہے کہ اس ناول کے ذریعے انھوں نے لکھنوی تہذیب و معاشرت، اس کے بازاروں اور محلّات، اس کے رسم و رواج، اس کے میلے ٹھیلوں اور ہر طبقے کے افراد کی نہایت کامیاب تصویر کشی کی ہے۔ فسانۂ آزاد کے دو مشہور کردار 'آزاد' اور 'خوجی' ہیں، جو اردو ادب میں زندہ کرداروں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ سرشارؔ کو زبان پر بھی بے پناہ قدرت حاصل ہے۔ وہ سادہ و سلیس نثر بھی لکھتے ہیں اور مزہ بدلنے کے لیے مقفّٰی اور مسجّع عبارت سے بھی گریز نہیں کرتے۔

سرشارؔ نے 'فسانۂ آزاد' کے علاوہ بھی کئی طبع زاد ناول 'جامِ سرشار'، 'سیرِ کہسار'، 'خدائی فوجدار' وغیرہ لکھے ہیں اور بعض ناولوں کے انگریزی ترجمے بھی کیے ہیں۔

شبلی نعمانی (1857-1914) : شبلی اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے۔ وہ ایک خوش حال گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ ابتدا میں اعظم گڑھ میں تعلیم پائی۔ بعد میں اسلامی علوم اور عربی ادب کی اعلیٰ تعلیم کے لیے انھوں نے رام پور، سہارنپور اور لاہور کا سفر کیا۔ فارسی اور عربی دونوں زبانوں پر انھیں قدرت حاصل تھی۔ شبلی شاعر بھی تھے۔ ان کا ادبی ذوق نہایت بلند اور پاکیزہ تھا۔

شبلؔی کے والد وکیل تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ شبلؔی بھی وکیل بنیں۔ چنانچہ وکالت کا امتحان پاس کر کے وکالت شروع کی لیکن جلد ہی اس پیشے سے اُکتا گئے۔ کچھ دن امینِ دیوانی کی حیثیت سے سرکاری ملازمت بھی کی۔ ان کی علمی وادبی زندگی کا آغاز صحیح معنوں میں اس وقت ہوا جب وہ 1883 میں ایم۔اے۔او۔ کالج، علی گڑھ میں عربی کے اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہوئے۔ یہاں انھیں نئے خیالات اور نئے علوم وفنون سے واقفیت کا موقع ملا۔ پروفیسر آرنلڈ جیسے استاد کی رفاقت اور سرسید کی صحبت کی بنا پر شبلؔی نے بہت جلد نئے ماحول میں اپنے لیے ممتاز جگہ بنالی۔ اب حالؔی اور ڈپٹی نذیر احمد کے ساتھ ساتھ شبلؔی کا شمار بھی سرسید کے نامور رفقا میں کیا جانے لگا۔

1898 میں سرسید کی وفات کے بعد وہ علی گڑھ کالج کی ملازمت سے مستعفی ہوگئے۔ 1901 سے 1905 تک حیدر آباد میں 'ناظم سررشتۂ علوم وفنون' رہے۔ 1905 میں وہ لکھنؤ آگئے اور 'ندوۃ العلما' کے تعلیمی شعبے کی ذمے داری سنبھال لی۔ شبلؔی کا خیال تھا کہ آنے والی نسلوں کو ایک ایسے نصابِ تعلیم کی ضرورت ہے جس میں قدیم وجدید دونوں علوم شامل ہوں۔ ندوۃ العلماء میں اس وقت کا نصابِ تعلیم شبلؔی کی فکر کا نتیجہ تھا۔ 1913 میں وہ یہاں سے مستعفی ہوگئے۔ اپنی کتابوں کے مواد کی فراہمی کے لیے انھوں نے مصر، ترکی اور شام کا بھی سفر کیا۔ ان کا ارادہ تھا کہ اعظم گڑھ میں 'دارالمصنفین' کے نام سے تحقیق وتصنیف کا ایک ادارہ قائم کریں۔ ان کا یہ خواب ان کی وفات کے بعد پورا ہوا۔

سرسیّد اور ان کے رفقا کے درمیان شبلؔی سب سے کم عمر ہیں، اس کے باوجود ان کے کاموں کا دائرہ خاصا وسیع ہے۔ ان کی تصانیف اور مضامین کے موضوعات سیاست، مذہب، فلسفہ، تاریخ، سوانح، سیرت، ادب، شاعری اور تنقید تک پھیلے ہوئے ہیں۔

شبلؔی کی نثر بہت خوب صورت اور دلکش ہے۔ انھوں نے سرسید احمد خاں اور محمد حسین آزؔاد دونوں کے درمیان

سے اپنی راہ نکالی ہے۔ ان کی نثر نہ تو بالکل بے رنگ اور سپاٹ ہوتی ہے اور نہ اس میں بہت زیادہ رنگینی اور آرائش پائی جاتی ہے۔ شبلؔی خیالات کی وضاحت کے ساتھ طرزِ ادا کے حسن کا بھی لحاظ رکھتے ہیں۔

شبلؔی نے حالؔی کے بعد سوانح نگاری کی روایت کو آگے بڑھایا۔ 'المامون' (1888) 'سیرۃ النعمان' (1890) اور 'الفاروق' (1899) ان کی مشہور سوانح عمریاں ہیں۔ 'موازنۂ انیس و دبیر' (1904) اور 'شعر العجم' (1906-1912) شبلؔی کی ادبی اور تنقیدی کتابیں ہیں۔ 'سیرت النبیؐ' شبلؔی کی آخری تصنیف ہے جسے ان کے شاگرد سیّد سلیمان ندوی نے مکمل کیا۔

رسوؔا (1857/58-1931) : ان کا اصل نام محمد ہادی، قلمی نام مرزا رسوا اور تخلّص مرزؔا تھا۔ وہ لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ پرائیویٹ طور پر میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ پھر اوورسیر کی سند حاصل کی۔ اس کے بعد بہ حیثیت اوورسیر ریلوے میں ملازم ہوگئے۔ ملازمت کے ساتھ ساتھ ان کی تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ 1887 میں پنجاب یونیورسٹی سے انھوں نے بی۔ اے۔ کیا۔

رسوا بہت سی خوبیوں کے مالک تھے۔ شعر و ادب کے علاوہ کیمسٹری سے انھیں بے حد دل چسپی تھی۔ ملازمت کے دوران ولایت سے کیمسٹری کے آلات منگوائے اور گھر پر تجربے کیے۔ کیمیا بنانے کا شوق اس قدر رہا کہ ملازمت ترک کر دی اور ضروریاتِ زندگی پوری کرنے کے لیے ٹیوشن کرنے لگے۔ وہ نخّاس مشن اسکول، لکھنؤ میں فارسی کے استاد بھی رہے۔ کچھ دنوں رائڈ کرسچین کالج، لکھنؤ میں بھی پڑھایا۔ آخر میں حیدر آباد جا کر دارالترجمہ میں ملازم ہوگئے اور وہیں اُن کی وفات ہوئی۔

رسوا ایک بلند پایہ ناول نگار تھے۔ ناول نگاری کے فن میں ان کا شعور بہت پختہ تھا۔ رسوا نے یوں تو چھے ناول لکھے ہیں، لیکن 'امراؤ جان ادا' ان کا شاہکار ہے۔ اس کا پلاٹ مربوط، کردار نگاری مؤثر اور مکالمے موزوں ہیں۔ یہ ناول لکھنوی تہذیب و معاشرت کے ایک خاص رُخ کی حقیقت پسندانہ ترجمانی کرتا ہے۔ مشاہدے کی گہرائی، جزئیات نگاری اور انسانی نفسیات پر گرفت کے لحاظ سے بھی یہ ایک اچھا ناول ہے۔ رسوؔا کے دوسرے ناولوں میں 'ذاتِ شریف' اور 'شریف زادہ' قابلِ ذکر ہیں۔

رسوا کی نثر صاف وشستہ اور اندازِ نگارش بے تکلف اور رواں ہے۔ محاورات اور روزمرّہ کے استعمال نے اس کے حسن میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔ مرقّع کشی اور منظر نگاری میں بھی انھیں کمال حاصل ہے۔ موقع بہ موقع ظرافت سے بھی کام لیتے ہیں۔

شرؔر (1926-1860) : ان کا نام عبدالحلیم اور تخلص شرؔر تھا۔ وہ لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ آٹھ نو سال کی عمر تک یہیں رہے۔ ان کے نانا منشی قمرالدین واجد علی شاہ کی ملازمت میں 'مٹیا برج' کلکتے میں رہتے تھے۔ 1869 میں انھوں نے شرؔر کو اپنے پاس بلا لیا۔ یہاں انھوں نے مختلف اساتذہ سے عربی، فارسی، منطق اور طِب وغیرہ کی تعلیم حاصل کی۔ اسی زمانے میں کچھ انگریزی بھی سیکھ لی۔ بعد میں لکھنؤ اور دہلی میں فقہ اور حدیث کا علم بھی حاصل کیا۔

شرؔر کو کم عمری سے مضمون نویسی کا شوق تھا۔ کلکتہ کے زمانۂ قیام ہی سے مختلف اخبارات میں ان کے مضامین شائع ہونے لگے تھے۔ وہ 'اودھ اخبار' کے نامہ نگار بھی تھے۔ 1880 میں وہ کلکتے سے لکھنؤ آئے اور اودھ اخبار کے ادارتی عملے میں شامل ہوگئے۔ 1888 میں انھوں نے لکھنؤ سے رسالہ 'دلگداز' جاری کیا۔ 1891 میں ریاست حیدرآباد میں ملازم ہوگئے۔ 1895 میں انگلستان کا سفر کیا۔ وہاں سے واپسی کے بعد 1898 میں 'دلگداز' کو دوبارہ حیدرآباد سے جاری کیا۔ 1900 میں لکھنؤ واپس آگئے۔ یہیں اُن کا انتقال ہوا۔

شرؔر کے مقالات اور تصانیف کے موضوعات میں بھی بڑی وسعت اور رنگارنگی پائی جاتی ہے۔ ان کے ادبی کارناموں میں ناول، تاریخ، انشائیہ، تنقید، صحافت، ڈراما وغیرہ شامل ہیں۔

شرؔر نے اردو میں تاریخی ناول نگاری کی بنیاد رکھی۔ 'فردوسِ بریں' ان کا سب سے اہم تاریخی ناول ہے۔ خود شرؔر کو اپنے ناولوں میں 'فردوسِ بریں'، 'ملک العزیز ورجنا'، 'فلورا فلورنڈا'، 'فتحِ اندلس' اور 'ایّامِ عرب' زیادہ پسند تھے۔

شرؔر نے تاریخی مضامین بھی لکھے ہیں اور بعض تاریخی کتابیں بھی تصنیف کی ہیں۔ لکھنؤ کی مذہبی و معاشرتی تاریخ پر مبنی 'گذشتہ لکھنؤ' ان کی مشہور کتاب ہے۔ شرؔر کو صحافت سے بھی دل چسپی رہی ہے۔ انھوں نے متعدد رسالے نکالے لیکن شہرت و مقبولیت کے لحاظ سے 'دلگداز' کا درجہ سب سے بلند ہے۔ ان کے ناول اسی میں قسط وار شائع ہوتے تھے۔ اردو کی ادبی صحافت میں اس رسالے کے کردار کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ آزاد نظم اور نظم معرّیٰ کو ترقی دینے میں بھی شرؔر کا خاص رول رہا ہے۔

راشد الخیری (1936-1868) : ان کا نام محمد عبدالراشد تھا۔ وہ دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے اجداد میں مولوی خیراللہ بڑے نیک بزرگ گزرے ہیں۔ اسی نسبت کے اظہار کے لیے انھوں نے 'خیری' کو اپنے نام کا جز بنا لیا تھا۔ بچپن میں انھیں پتنگ بازی کا بڑا شوق تھا اس لیے تعلیم میں ان کا دل نہیں لگا۔ لیکن راشد کے والدہ نے انھیں مولوی

نذیر احمد کے سپرد کر دیا۔ جو اُن کے پھوپھا تھے۔ استاد کی صحبت رنگ لائی اور راشد الخیری کو تعلیم کا ایسا چسکا لگا کہ پھر انھوں نے خود ہی تعلیمِ نسواں کے لیے ایک ادارہ قائم کر لیا۔ انھوں نے عورتوں کی اصلاح اور فلاح و بہبود کے لیے ناول اور افسانے بھی لکھے اور 'عصمت' کے نام سے ایک رسالہ بھی جاری کیا۔

راشد الخیری کو مُصوّرِ غم بھی کہا جاتا ہے۔ 'سیّدہ کا لعل' لکھنے کے بعد انھیں یہ لقب ملا تھا۔ وہ طبیعت کے لحاظ سے بذلہ سنج بھی تھے۔ چنانچہ 'دادا لال بُجھکّڑ'، 'نانی عشّو' اور 'ولایتی ننّھی' اسی قبیل کے ناول ہیں۔ 'سمرنا کا چاند'، 'صبحِ زندگی'، 'ماہِ عجم'، 'محبوبۂ خداوند' اور 'منازل السائرہ' ان کی مشہور کتابیں ہیں۔ انھوں نے دہلی میں انتقال کیا۔